اڑنے والا گھوڑا

پچھلے دنوں انٹرنیٹ پر ایک وڈیو دیکھی ۔ یہ ایک طوفانی رات کی وڈیو تھی جس میں مکہ کی فضاؤں میں ایک اڑتے ہوئے گھوڑے کے منظر کو ریکارڈ کرلیا گیا تھا۔بجلی کی چمک اور کڑک میں گھوڑا اڑ رہا ہے اور ساتھ میں لوگ سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ کبر کہہ رہے ہیں۔

یہ وڈیو جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہوگئی اور ہر طرف لوگ اسے اسلام کی سچائی کا ثبوت قرار دینے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جدہ میں کھلونوں کی دکان پر رکھا ایک گھوڑا تھا۔اس میں گیس بھری تھی اور ایک ڈور کی مدد سے اسے ہوا میں اڑایا جاتا تھا۔طوفانی ہوا میں ڈور ٹوٹ گئی اور یوں گھوڑا واقعی اڑنے لگا۔لوگوں نے یہ منظر اور اس کی وڈیو بنا کر نیٹ پر ڈال دی۔ پھر جدہ مکہ بن گیا اور اسلام کی حقانیت ایک نئے پہلو سے ثابت کردی گئی۔

اس طرح کے واقعات نہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں ہر سنی سنائی بات بلا تصدیق آگے بڑھانے کا کتنا ''ذوق'' ہے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں مسلمان اپنی کتاب قرآن مجید سے کس درجہ میں ناواقف ہیں جو ہوا میں اڑتے ہوئے گھوڑوں کے بجائے زمین پر چلنے والے گھوڑوں اور ہوا میں اڑتے پرندوں کو اپنی حقانیت کا ثبوت بنا کر پیش کرتا ہے۔ بلاشبہ زمین پر چلنے والے گھوڑے اور ہوا میں اڑتے پرندے ایک عظیم معجزہ ہیں، مگر چونکہ یہ معمول کے واقعات ہیں اس لیے کوئی نہیں جوان کو دیکھ کر سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ کبر کہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی خدا کی کتاب قرآن مجید تو ہمات کی نہیں علم کی کتاب ہے۔اس میں گھوڑوں اور پرندوں پر ہی نہیں بلکہ شہد کی مکھی اور صحرا کے اونٹ سے لے کر زمین و آسمان کی ہر نشانی پر تفکر کی دعوت دی گئی۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں کا ہونا خدا کے ہونے اور تمہارا رب ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں چلنے والے گھوڑوں، اڑنے والے پرندوں اور زندگی کی ہر قسم کا ہونا ایک معجزہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم جن چلنے والے گھوڑوں اور اڑنے والے پرندوں کو دیکھتے ہیں، وہ ایک ایسی کائنات کے باسی ہیں جو ہر اعتبار سے زندگی کی ہر قسم کے لیے ایک قاتل کائنات ہے۔ آج کا انسان یہ بات سب سے بڑھ کر جانتا ہے کہ اس کائنات میں زیادہ تر وہ مہیب خلا ہے جہاں نہ سانس لینے کو آکسیجن ہے، نہ پینے کو پانی ہے، نہ کھانے کو غذا ہے۔ اس خلا میں اگر سیارے ہیں تو ان کا درجہ حرارت اتنا کم ہے کہ زندگی کی ہر قسم کو وہ فوراً ختم کر دے گا۔ اگر چٹانیں ہیں تو زندگی کی ہر قسم کے لیے موت کا پیغام ہیں۔

باقی کائنات ستاروں یا بلیک ہول پر مشتمل ہے۔ ستارے اتنی گرم اور ایسی خوفناک آگ اگل رہے ہیں کہ ان سے لاکھوں میل کے فاصلے پر موجود ہر گھوڑے، انسان اور پرندے کی ہڈیاں بھی پگھل جائیں گی۔ جبکہ بلیک ہولز مادہ کی ہر شکل ہی کو نہیں روشنی اور توانائی کو بھی اپنے اندر نگل کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہاں زندگی کا کیا سوال۔ اس کے علاوہ بھی کائنات میں اگر کچھ ہے تو زندگی کی ہر قسم کے لیے اس کا مطلب موت کے سوا کچھ اور نہیں۔

یہ ہے وہ کائنات جس میں استثنائی طور پر کرہ زمین پایا جاتا ہے۔ کائنات کے اس قبرستان میں زندگی کا یہ گہوارا تن تنہا کھڑا اپنے خالق و مالک، اپنے حاکم و ناظم اور رب مہربان کا زندہ تعارف بن کر کھڑا ہے۔ اس کرہ ارض پر پانی ہے۔ یہاں ہریالی ہے۔ کھلی فضا ہے۔ سمندر اور دریا ہیں۔ زرخیز مٹی اور برف سے لدے پہاڑ ہیں۔ حیات کی باقی اقسام کو چھوڑیے یہاں زمین پر چلنے والے گھوڑے ہیں اور آسمان پر اڑنے والے پرندے ہیں۔ پھر یہاں قرآن مجید ہے جو لوگوں کے سامنے ان چلنے والے گھوڑوں اور اڑنے والے پرندوں کو بطور نشانی پیش کرتا ہے۔

آہ! مگر یہ بدنصیب حاملین قرآن اڑنے والے پرندوں اور زمین پر چلنے والے گھوڑوں کو

دیکھتے ہیں اور چیخیں مار کر نہیں روتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے۔ ان کی زبان سے سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے الفاظ نہیں نکلتے۔ وہ اڑتے ہوئے گھوڑے تلاش کرتے اور ان کو اسلام کی سچائی کا ثبوت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے کہ کسی روز ایسا کوئی گھوڑا اگر واقعی نظر آ گیا اور ویٹیکن میں نظر آ گیا تو کیا مسیحیت سچا مذہب بن جائے گی؟ ہمیں جان لینا چاہیے کہ اسلام توہمات کی نہیں، علم کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ اس کی دعوت ایک ایسے دور کے لیے ہے جب علم سچائی کی بنیاد بن چکا ہے۔ جدید انسان اب توہمات کی نہیں علم کی بنیاد پر جیتا ہے۔ اور قرآن مجید اس کی طلب کا بہترین جواب ہے۔

مگر بدقسمتی سے سردست یہ قرآن مجید بغیر سمجھے پڑھنے کے کام آتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب مسلمان قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیں۔ جس کے بعد وہ اڑنے والے گھوڑوں کے بجائے چلنے والے گھوڑوں میں خدا کی عظمت کو تلاش کریں گے اور اسے دنیا کے سامنے بیان کریں گے۔ مسلمانوں کو یہ کرنا ہوگا۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ یہ نہیں کریں گے تو غیر مسلم خدا کا انکار کر کے مسلمانوں کی دنیا اور اپنی آخرت دونوں خراب کرتے رہیں گے۔

ٹیپ ریکارڈر

ٹیپ ریکارڈر دورجدید کی اہم ترین ایجادات میں سے ہے۔آج کے جدید آلات کے بعد تو یہ اپنی اصل قدر و قیمت کھو چکا ہے،مگر بیسویں صدی میں یہ تفریح کا اہم ترین ذریعہ تھا۔لوگ اپنی پسند کا میوزک،قوالیاں،تقریریں وغیرہ ریکارڈ کرواتے اورروزانہ ان کو سنا کرتے۔

یہ ٹیپ ریکارڈر بظاہر تو ایک مشین ہے لیکن یہ ایک خاص قسم کے انسانوں کا بہترین تعارف بھی ہے۔ یہ انسان اپنے تعصّبات کے اسیر ہوتے ہیں۔اس کے بعد ہر مجلس، ہر محفل اور ہر فورم پر ٹیپ ریکارڈ کی طرح چلنا شروع ہوجاتے ہیں۔یہ لوگ ٹیپ ریکارڈر کی طرح ون وے کمیونیکیشن (communication) کا آلہ بن جاتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں سنتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ بس بولتے، بولتے اور بولتے چلے جاتے ہیں۔

آپ ان کے نقطہ نظر کی غلطی کتنے ہی مدلل طریقے پر ثابت کردیں۔ان کے انداز فکر کی کجی کتنی ہی مثالوں سے واضح کردیں۔ کتنے ہی معقول طریقے پر ان کے استدلال کے بخیے ادھیڑ دیں،آپ یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ آپ نے انھیں جہاں سے چھوڑا تھا یہ وہیں سے اپنی گفتگو شروع کریں گے۔ایسا لگے گا کہ انھوں نے کچھ نہیں سنا۔اگر مجبوراً سنا تو کچھ سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔صم بکم عمی فھم لا یرجعون ۔

یہ رویہ کوئی اور اختیار کرے تو قابل درگزر ہے،مگر جب ایک مسلمان مذہبی شخص اپنے تعصّبات کی بنا پر اس طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن اپنی معافی اور درگزر کے تمام امکانات ختم کررہا ہوتا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید جگہ جگہ اس کو کفار کے رویے کے طور پر بیان کرتا ہے اوراسی کو ان کے جہنم میں جانے کا سبب قرار دیتا ہے،(ملک 10:67)۔

حقیقت یہ ہے کہ حاملین قرآن کا جو گروہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی سطح پر زندگی گزارے گا، وہ اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کے لیے پیش کررہا ہے۔

نیت اور شہادت

جنگ احد تین ہجری میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں ابتداء میں مسلمانوں کا پلا بھاری تھا مگر پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں ستر مسلمانوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ قرآن مجید نے سورہ آل عمران (140:3) میں ان لوگوں کو شہداء قرار دے کر حیات ابدی کی نوید سنائی، (169:3)۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے قزمان نامی ایک جنگجو نے حصہ لیا۔ وہ اس جنگ میں بے مثل بہادری کے ساتھ لڑا۔ قریش کے تین علمبرداروں سمیت اس نے تن تنہا آٹھ کفار کو ہلاک کر دیا۔ جنگ کے بعد وہ اس حال میں ملا کے زخموں سے چور چور تھا۔ اسے جنت کی خوشخبری سنائی گئی تو بولا کہ میں دین کے لیے نہیں بلکہ اپنی قوم کی عزت کے لیے اور اس لیے لڑا ہوں کہ قریش کے قدم ہماری زمین کو پامال نہ کر سکیں۔ اس کے بعد اس نے شدت تکلیف سے خود کشی کر لی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ وہ جہنمی ہے۔ یہ پوری تفصیل ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن کثیر نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کس کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے اور کون اسے مار رہا ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کے جنگ کرنے والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا عظیم شرف حاصل کر رہا ہو اور اسے مارنے والے وہ کفار مکہ ہوں جن کے کفر پر قرآن گواہ ہے تب بھی اصل اہمیت اپنی نیت کی ہوتی ہے۔ اگر اس کی نیت نصرت دین کے بجائے اپنی قبائلی اور قومی تعصب کے لیے لڑنے کی ہو، خدا کے دشمنوں کے بجائے اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف لڑنے کی ہو تو اس کی موت رائگاں اور اس کی جنگ بے کار ہے۔ اس کا انجام وہی ہوگا جو قزمان کا ہوگا۔

شدید محبت شدید خواہش

شدید محبت اور شدید خواہش۔ یہ دو الفاظ دین کی اس دعوت کا خلاصہ ہیں جسے لے کر سوا لاکھ کے قریب انبیا تشریف لائے اور جس کی آخری شکل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہیں۔

شدید محبت سے مراد اللہ کی محبت ہے۔اس سے مراد اللہ کی یاد میں کھوئے رہنا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت پر کوئی دوسری محبت غالب نہ ہو سکے۔ مال، اولاد، بیوی اور سب سے بڑھ کر اپنا نفس اس کی رضا کے خلاف کچھ نہ کرا سکیں۔اور غلطی ہو جائے تو فوراً تڑپ کر اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

شدید خواہش سے مراد جنت کی شدید خواہش ہے۔اوپر جن چیزوں کا ذکر ہے یعنی مال اولاد وغیرہ کی طلب بالکل فطری ہے۔مگر قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ جنت سے پہلے یہ چیزیں آزمائش کے لیے دی گئی ہیں اور بہت جلد لے لی جائیں گی۔جبکہ جنت کے بعد یہ بطور انعام دی جائیں گی اور ہمیشہ پاس رہیں گی۔ اس لیے ان چیزیوں کی خواہش غلط نہیں بلکہ غلطی دنیا کی خواہش میں مبتلا ہونا ہے۔جبکہ کرنے کا کام خواہش کا رخ جنت کی طرف پھیرنا ہے۔

بدقسمتی سے ہمیشہ اکثر لوگ خدا کے بجائے غیر اللہ کی محبت میں جیتے ہیں جنت کے بجائے دنیا کے طلبگار رہتے ہیں۔اس لیے کہ خدا نظر آتا ہے نہ جنت۔لیکن نظر نہ آنے والے خدا کی شدید محبت اور نظر نہ آنے والی جنت کی شدید خواہش ہی آخرکار یہ معجزہ جنم دے گی کہ فانی انسان ابدیت کا قالب اوڑھ کر فردوس بریں کو آباد کرے گا۔

ہم سب لوگوں کو ابدی بادشاہی حاصل کرنے کا یہ عظیم موقع ملا ہے۔خوش نصیب ہیں وہ جو اس موقع کر پہچان کر اللہ کی شدید محبت اور جنت کی شدید خواہش کو اپنی زندگی بنا لیں۔

جینے کی سطح

انسان ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس دنیا کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کرہ ارض کو چھوڑ کر یہاں ہر جگہ موت کا راج ہے۔ پوری کائنات میں زندگی کی ایک رمق بھی نہیں پائی جاتی۔ مگر اس کرہ ارض پر زندگی لاکھوں انواع کی شکل میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ زمین پر پائی جانے والی زندگی کی تقریباً 87 لاکھ اقسام میں سے انسان وہ واحد نوع ہے جو بیک وقت عقل، وجدان اور ذوق جمال رکھتا ہے۔

ان تینوں کے ساتھ جب انسان دنیا پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے ہر طرف تنظیم و ترتیب، مقصدیت اور جمال و کمال نظر آتا ہے۔ سورج، سمندر، فضا، ہوا، بادل، پہاڑ اور زمین مل کر حیرت انگیز طور پر انسان کی غذا کو تخلیق کرتے ہیں۔ یہ غذا گھاس پات نہیں ہوتی بلکہ ان گنت ذائقوں کے پھل، سبزی، اناج اور پھر گوشت، دودھ، مرچ مصالحوں کا ختم نہ ہونے والا دسترخوان بچھا دیتا ہے۔ پھر انسان کے ذوق جمال کی تسکین کے لیے پھول سبزہ، چاند ستارے، صبح و شام، رنگ و روشنی، روپ اور خوشبو کی لامحدود دنیا آباد ہے۔

اس دنیا میں جینے کی ایک سطح جانور کی ہے۔ یہ کھانے پینے اور نسل کشی میں لگے رہنے کی سطح ہے۔ دوسری سطح فرشتوں کی سطح ہے۔ یہ صرف تسبیح و عبادت کی سطح ہے۔ تیسری سطح انسان کی ہے۔ یہ نعمتوں پر حمد کے نغمے گانے، شکر گزاری کرنے، گناہ سے رکنے اور مشکلات پر صبر کرنے کی سطح ہے۔ اس سطح کا انسان اس دنیا کے حسن و لذت سے لطف اندوز ہوتا اور تڑپ کر مالک کا شکر ادا کرتا ہے۔ یہ نافرمانی سے رکتا اور رب کے لیے نفس کے تقاضوں کو دبا دیتا ہے۔ یہ مشکل پر اللہ کی رضا کے لیے حق پر ثابت قدم رہتا ہے۔ یہی وہ سطح ہے جس پر جینے کا بدلہ لامحدود جنت ہے۔ یہی وہ سطح ہے جس پر جینے والے بہت کم ملتے ہیں۔

حجامت

آج کی نشست میں عارف اپنا ایک واقعہ سنا رہے تھے جو کل شب انھوں نے حجام کی دکان پر دیکھا تھا۔ سامعین پوری توجہ سے ان کی بات کو سن رہے تھے۔

''بچے کی عمر یہی کوئی ایک برس ہوگی۔ اس عمر کے بچوں کی معصومیت تو ویسے ہی دل موہ لیتی ہے، مگر یہ گول مٹول اور سرخ وسفید بچہ اور بھی پیارا لگ رہا تھا۔ مگر اِس وقت وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کے دادا اسے گود میں بٹھائے ہوئے تھے اور حجام بڑی تیزی اور مہارت سے اس کے بڑھے ہوئے بالوں کو چھانٹنے میں مصروف تھا۔ حجام کے کہنے پر دادا نے بچے کے دونوں ہاتھ بھی پکڑ لیے کہ اس کی مزاحمت حجام کی قینچی کا رخ بالوں سے ہٹا کر اس کی جلد یا سر کی طرف نہ کر دے۔

اس پر بچے کی آہ وفغاں میں اور اضافہ ہوگیا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوں جاری ہوگئے۔ دادا نے اپنی گرفت کم نہیں کی۔ وہ ہنسا کر، باتیں کر کے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے، مگر بچہ روتا رہا۔ آخر کار حجامت ختم ہوئی۔ بچہ فوراً چپ ہوگیا۔ مگر اب اس کی خوبصورت شکل تراشے ہوئے بالوں کے ساتھ اور نکھر گئی تھی۔ یہ وہ فرق تھا جو بچے کے علاوہ ہر شخص کو سمجھ میں آ گیا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ بچہ بھی یہ بات سمجھنے لگے گا۔''

یہ آخری جملہ کہتے ہوئے عارف مسکرانے لگے اور پھر بولے:

''حجامت کا یہ واقعہ ایک دوسرے پہلو سے ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ پیش آتا ہے۔ زندگی میں ایک سے زیادہ مواقع پر ہماری ''حجامت'' شروع ہوجاتی ہے۔ یہ ''حجامت'' کبھی دکھ اور بیماری کے ہاتھوں ہوتی ہے تو کبھی تنگی ومحرومی کے ذریعے سے۔ کبھی حالات کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہوتی ہے تو کبھی اپنے اور بے گانوں کے ہاتھوں سے دیے گئے زخم اس کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ حجامت جب بھی ہوتی ہے، ہم بے چین ہوجاتے ہیں۔ تڑپتے اور روتے ہیں۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہوتی بلکہ بارہا حالات کے آہنی ہاتھ اس طرح ہمیں اپنی گرفت میں لیتے ہیں کہ ہر

مزاحمت کا امکان ختم کر دیتے ہیں۔
بے کسی اور بے بسی کے ان لمحوں میں ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا۔ کوئی دلاسہ کافی نہیں ہوتا اور کوئی تسلی دل کو سکون نہیں دیتی۔ قرار لٹ جاتا ہے اور چین کی دنیا برباد ہو جاتی ہے۔ بے سکونی اور بے صبری کے ان لمحوں میں نہ دعا کام آتی ہے، نہ وظیفے مسئلہ حل کرتے ہیں۔ لیکن معصوم بچے کی حجامت کا یہ سبق یاد رہے تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دکھ، یہ بیماری، یہ پریشانی، یہ محرومی زندگی کے عارضی واقعات ہیں۔ ان کا مقصد ہمیں بہتر بنانا ہوتا ہے۔''
محفل پر سناٹا طاری تھا۔ اگر کوئی آواز تھی تو معرفت کی اس بہتی آبشار کی تھی۔
''انسانی زندگی عام حالات میں خوشیوں اور نعمتوں سے عبارت ہوتی ہے۔ مگر اکثر انسانوں کو نعمتیں؛ غفلت اور معصیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ چیزیں انسان کے اخلاقی وجود کو مکروہ اور بدصورت بنا دیتے ہیں۔ دنیا والوں کو شاید یہ اخلاقی مکروہ پن محسوس نہ ہو، مگر رب کریم کا حسن لازوال اپنے بندوں کو ایسی غلاظت میں لتھڑا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی شفقت جوش مارتی ہے۔ وہ حالات کو قینچی بنا کر اپنے لونڈی غلاموں کی حجامت کر دیتا ہے۔ یہ حجامت اپنوں ہی کی ہوتی ہے۔ غیروں کو تو وہ اخلاقی نجاستوں کی دلدل ہی میں چھوڑ کر بے پروا ہو جاتا ہے۔
اس لیے جب زندگی میں ''حجامت'' شروع ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ عارضی مرحلہ ہے۔ جلد گزر جائے گا''، بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک صاحب بول اٹھے۔
''مگر میں تو کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری ایسی حجامت ہو۔ کیا اس کا بھی کوئی نسخہ ہے؟''
''ہاں ہے اور بہت آسان نسخہ ہے۔ اپنے اخلاقی وجود کی گہری نگہداشت کریں۔ اسے حرص، ہوس، تکبر، نفرت، تعصب، غفلت سے دور رکھیں۔ کثرت سے اللہ کے حضور استغفار کرتے رہیں۔ یقین جانیں پھر آپ پر ہمیشہ بہت ہلکا ہاتھ رکھا جائے گا۔''
محفل تمام ہوئی اور معرفت کا ایک اور سبق سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو گیا۔

یاسر پیرزادہ

رزلٹ کارڈ ضروری یا ''تربیت کارڈ''

ہم عجیب لوگ ہیں اور ہماری تربیت کا معیار بھی عجیب ہے، ہمارا شمار غالباً دنیا کی ان چند قوموں میں ہوتا ہے جس کے والدین کو اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں شدید فکر لاحق رہتی ہے، ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ بہترین درس گاہ میں تعلیم پائے، اسکالرشپ حاصل کرے، اے گریڈوں کے انبار لگا دے، اس کی قابلیت کی بنیاد پر غیر ملکی یونیورسٹیاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیں اور جب وہ اپنی ڈگریاں جیب میں ڈال کر بازار میں نکلے تو مائیکروسافٹ سے لے کر گوگل تک دنیا کی بہترین کمپنیاں اسے منہ مانگی تنخواہ پر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں...... ان میں سے کوئی بھی خواہش ناجائز نہیں بلکہ سچ پوچھیں تو جو والدین اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں انہیں ایسا ہی سوچنا چاہئے، مگر کیا یہ کافی ہے؟ اس پلاننگ میں کہیں اخلاقیات ،اقدار یا بلوغت کی عمر تک پہنچنے والے بچے بچیوں کی تربیت کا کوئی اشارہ ملتا ہے؟ کیا اپنے بچوں کو فلم دکھانے سے پہلے ہم اس کی PG ریٹنگ چیک کرتے ہیں، کیا ہمیں اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ گھنٹوں اکیلا کمرے میں بیٹھا کیا کرتا رہتا ہے، کیا اٹھارہ برس سے کم عمر بچوں کے لیے پرائیویسی ضروری ہوتی ہے، کیا کچی عمروں کے بچوں اور بچیوں کے پاس اپنا ذاتی ٹیبلٹ ہونا چاہئے جس میں ان کا اپنا فیس بک اکاؤنٹ ہو جس کا ان کے والدین کو کچھ علم نہ ہو، کیا ذاتی موبائل فون بچوں کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے یا اس کے بغیر کام چل سکتا ہے، کیا بچوں کو اجنبی لوگوں کے گھروں میں بھیجنا درست بات ہے، اور آزاد خیالی اپنی جگہ مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ اٹھارہویں سالگرہ کا کیک کاٹتے ہی بچے بچیوں پر وہ تمام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں جو ایک دن پہلے تک ان کے لیے شجر ممنوعہ تھیں؟

ہماری نظریں اپنے بچے کے رزلٹ کارڈ کا معائنہ تو بغور کرتی ہیں، نمبر کم آئیں تو اس کی سرزنش کی جاتی ہے، اسکول میں اساتذہ سے مل کر پریشانی کا اظہار کیا جاتا ہے، اپنا پیٹ کاٹ کر ٹیوشن رکھوائی جاتی ہے اور پھر بچے کے ذہن میں یہ بات نقش کروائی جاتی ہے کہ اگر ایف ایس سی میں نمبر نہ آئے تو سمجھو ساری زندگی ناکامی کا منہ دیکھتے رہوگے......مگر کتنے والدین ایسے ہیں جن کے نزدیک بچے کے رزلٹ کارڈ سے زیادہ ''تربیت کارڈ'' کی اہمیت ہے، کتنے ماں باپ کو پتہ ہوتا ہے کہ ان کا بچہ جن دوستوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے ان کی حرکتیں کس قسم کی ہیں، دوستوں کے اس گروپ کی اسکول میں کیا ریپوٹیشن ہے! بچیوں کے معاملے میں تو اور بھی زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے مگر کیا ہم وہ احتیاط برتتے ہیں، کیا ہمیں اس بات کا ادراک ہے کہ بچوں کی پرائیویسی ان کے لیے کس حد تک خطرناک ثابت ہوسکتی ہے، کیا بچوں کے معاملے میں آزادی کی حدود کا ہم نے تعین کر رکھا ہے، کیا بچوں کے لاڈ اٹھاتے اٹھاتے کہیں ہم ان کے مستقبل کا نقصان تو نہیں کر رہے؟ سوال زیادہ ہیں اور جواب کم!

تین قسم کے چیلنج ہیں جو آج کل کے والدین کو درپیش ہیں، پہلا طبقاتی کشمکش، جب بھی ہم اپنے بچوں کو کسی چیز سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ کہہ کر منع کرتے ہیں کہ ابھی تم بچے ہو، بڑے ہوکر تمہیں اس کی اجازت ہوگی تو جواب میں بچہ کہتا ہے ''مگر ہماری کلاس میں تو سب بچوں کے پاس موبائل فون ہیں، پھر آپ مجھے کیوں منع کرتے ہیں!'' اس ''دلیل'' کا ایسا جواب دینا جو بچے کو مطمئن کر دے بے حد مشکل کام ہے، آپ لاکھ بچے کو سمجھائیں کہ باقی لوگ غلط کرتے ہیں، اتنی چھوٹی عمر میں بچوں کے پاس موبائل فون نہیں ہونا چاہئے مگر بچہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوگا، اسے لگے گا جیسے والدین اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں یا پھر ماں باپ کو اس پر اعتماد نہیں ہے، اور یہ رجحان صحت مند نہیں۔ دوسرا چیلنج، محنت کی کمی، زندگی کی دوڑ دھوپ میں

والدین کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ جتنی محنت وہ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں اس محنت کے کچھ حصے پر ان کے بچوں کا بھی حق ہے، والدین کا خیال ہوتا ہے کہ یہ محنت دراصل وہ اپنے بچوں کے لیے ہی کرتے ہیں جو کسی حد تک درست بھی ہے مگر بچوں کی پرورش اور تربیت اضافی محنت مانگتی ہے، والدین جو پہلے ہی تھک چکے ہوتے ہیں اس اضافی محنت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہتے لہٰذا وہ خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ ان کی پوری زندگی کا محور بچوں کا مستقبل ہے، جس کا مطلب کہ ان کی بہترین اسکولنگ ہے اور اس کو یقینی بنانے کے لیے وہ دن رات محنت کرتے ہیں، یہی بچوں سے ان کی محبت کا ثبوت ہے۔ یہ سائیکل یونہی چلتی رہتی ہے اور پھر ایک دن وہ اپنے بچوں کے ساتھ کوئی ''ڈرٹی پکچر'' دیکھ کر سینما ہال سے برآمد ہوتے ہیں۔ تیسرا چیلنج تیزی سے تبدیل ہوتا ہوا وقت، ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جو ہر آنے والے دن میں اپنے ساتھ ایسی حیران کن تبدیلیاں لے کر آتا ہے جو آج سے ہزار سال پہلے کئی دہائیوں میں بھی رونما نہیں ہوتی تھیں، مگر ہم میں سے کئی لوگ اب تک اس برق رفتار تبدیلی کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بارہ چودہ سال کی بچی کے پاس ذاتی ٹیبلٹ، اس کا فیس بک اکاؤنٹ، اس کا ذاتی کمرہ، اس کی پرائیویسی، اپنی ہم جولیوں کے ساتھ اکیلے گھومنے جانا، آج سے بیس برس پہلے تک ان باتوں کا تصور نہیں تھا، مگر آج یہ سب کچھ ''نارمل'' لگتا ہے، ہم نے اس تبدیلی کو قبول تو کر لیا ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا مگر اس تبدیلی کے کیا مضمرات ہیں، اس کا ہمیں اندازہ نہیں ہو پا رہا۔

وقت کی کمی اور محنت سے جی چرانا، اپنے سے اونچے طبقے میں چھلانگ لگا کر پہنچنے کا خبط اور تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کے چیلنجوں نے ہمیں ایسا ادھ موا کر دیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کے رزلٹ کارڈ سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں پاتے۔ حالانکہ ان کی تربیت کا بھی ایک کارڈ ہونا

چاہیئے کس پر ہماری گہری نظر ہو، ہمیں علم ہو کہ ہمارے بچے بچیاں کس ڈگر پر چل رہے ہیں، کیا سوچتے ہیں، ان کے دوست کیسے ہیں، کیا وہ اپنی پرائیویسی پر اصرار کرتے ہیں، اگر ایسا ہے تو کیوں ہے؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی اے گریڈ ہو تو ہمیں ان کو وقت دینا ہو گا، ان کے ساتھ محنت کرنی ہو گی، اپنے آرام کی قربانی دینا ہو گی اور آج کل کے نت نئے gadgets اور ان کے مضمرات سے مکمل طور پر آگاہ رہنا ہو گا تا کہ اپنے بچوں سے بات چیت کے دوران ہم انہیں ان کی زبان میں قائل کر سکیں اور انہیں یہ نہ لگے کہ ان کے والدین outdated ہو چکے ہیں جنہیں یہ نہیں پتہ کہ فیس بک پر پکچر ٹیگنگ کس بلا کا نام ہے!

پروفیسر محمد عقیل

دل کی بورنگ

آج کل کراچی میں پانی کی قلت ہے جس کی بنا پر لوگ اپنے گھروں میں بورنگ کروا رہے ہیں۔ یہ بورنگ اوزار کی مدد سے زمین میں کی جاتی ہے اور ڈرلنگ کے ذریعے زمین کی تہہ میں اس سطح تک پہنچا جاتا ہے جہاں پانی موجود ہو۔ اس کے بعد موٹر کے ذریعے پانی حاصل کرلیا جاتا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ بورنگ ناکارہ ہوتی جاتی ہے۔ اور اس سے پانی کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک وجہ تو پانی کے لیول کا نیچے چلا جانا ہے جس کی بنا پر سوتے خشک پڑ جاتے ہیں۔ دوسری وجہ بورنگ کی نالی میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو جانا ہے۔ بعض اوقات وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سیورج کا پانی مکس ہو جاتا ہے جس کا استعمال مضر صحت ہوتا ہے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، ناکارہ بورنگ سے پانی کے حصول کی کوشش ایک نامناسب اور بعض اوقات نقصان دہ عمل ہے۔ اگر صاف پانی حاصل کرنا ہے تو نئے سرے سے پانی کے سوتوں تک رسائی حاصل کرنی لازمی ہے۔

پانی کی بورنگ کی طرح روحانیت اور تعلق باللہ کی بھی بورنگ ہوتی ہے۔ بعض اوقات جب ہم اپنے دل کا تعلق اللہ سے جوڑ لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ساری زندگی یہ تعلق ایسے ہی قائم رہے گا اور اس کنکشن سے بغیر کسی محنت و صفائی کے روحانی غذا ملتی رہے گی۔ بعض اوقات ہمیں یہ غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے کہ ہم تو اللہ کی بندگی میں آ گئے ہیں اب تزکیہ و تربیت کی کیا ضرورت؟ کبھی ہمارا دل ہمیں تکبر کا راستہ دکھا کر یہ سکھاتا ہے کہ ہم اب علم و عمل میں طاق ہو گئے ہیں اور اب ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ کبھی ہمارا نفس تن آسانی کا شکار ہو کر محنت چھوڑ دیتا ہے تو کبھی زمانے کی گردشیں ہماری راہ کھوٹی کرنے پر تل جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ کنکشن شیطان کی دراندازی، نفس کی

حملہ آوری کی بنا پر کمزور ہوتا رہتا اور بالآخر ناکارہ ہوجاتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا تعلق اللہ سے کمزور ہونے لگتا ہے، اور آہستہ آہستہ ہم شیطان کے فریب میں باآسانی آجاتے ہیں۔اس کے علاوہ ہم اپنی انا کے زعم میں تکبر کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کی حکم عدولی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم اپنی راہ سے دور ہوچکے ہیں۔ہم لاعلم ہوتے ہیں کہ ہماری روحانیت کے سوتے خشک ہوگئے، ہماری بورنگ میں غلاظتوں کی آمیزش ہوچکی، ہمارا تعلق باللہ کے کنکشن کا پائپ چوک ہوچکا۔

یہ معاملہ زیادہ تر ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو دین کا کوئی کام کررہے ہوتے ہیں۔ ہمیں علم ہی نہیں ہوتا کہ دوسروں کو دعوت وتبلیغ دینے کی مصروفیت میں خود کو بھول چکے، دوسروں کو راستہ بتاتے بتاتے خود ہی راہ راست سے ہٹ گئے، دوسروں کو آگ سے بچاتے بچاتے اپنے دامن کو آگ کے شعلوں کی نذر کرچکے۔

بس ہمیں ہر لمحے اپنے تعلق باللہ کے کنکشن کا جائزہ لیتے رہنا ہے ، اس کی لی کیج (Leakage) پر نگاہ رکھنی ہے،اس کے سوتے تر رکھنے ہیں۔اور اگر ہم ذرا بھی نوٹ کریں کہ ہماری بورنگ خشک پڑ رہی ہے تو نئے سرے سے کھدائی کریں، اگر تعلق باللہ کا لیول پہنچ سے باہر ہورہا ہو تو کھدائی کو اور گہرا کریں۔ اگر روحانیت سے سرچشموں میں گندگی کی آمیزش شامل ہورہی ہو تو تزکیہ نفس سے اسے پاک کریں۔

روحانی بورنگ کا نیا کنکشن لینے کے کئی طریقے ہیں۔ایک طریقہ سیزنل ہے یعنی موسم اور ماحول کے ذریعے تعلق باللہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ رمضان میں یہ موقع سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ذوالحج میں شیطان کی دراندازیوں کو جاننا اوران سے بچنے کا طریقہ سیکھنا ایک اور

اہم موقع ہے۔بعض اوقات یہ ماحول کسی مصیبت ، رنج، الم یا آفت کے نتیجے میں مل جاتا ہے جس کے ذریعے تعلق باللہ کے خشک سوتوں کو تر کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ کثرت عبادت ہے۔نمازوں کی کثرت خاص طور پر تہجد کی نماز، نفلی روزے، عمرے، قربانی، انفاق وغیرہ اللہ سے کمزور تعلق کو مضبوط کرتے ہیں۔اس کے علاوہ لوگوں کی خدمت، ان کے ساتھ احسان کا رویہ اوران کی مدد اللہ سے تعلق کا سبب بنتی ہے۔کبھی کبھی علم کی کمی کو دور کرنا، اللہ کے نیک بندوں کی صحبت، عمل کو بہتر بنانا یا بنانے کی لگاتار کوشش کرتے جانا، برائیوں کو ترک کرنا، اچھائیوں کو اپنانا اس راہ میں اکسیر کا کام کرتا ہے۔

سب سے بڑھ کر دعا، توکل ،تفویض و رضا وہ ماسٹر کی (Master key) ہے جس سے خشک سوتے تر ہوجاتے اور وہاں تعلق باللہ کے تازہ چشمے ابل پڑتے ہیں۔دعا کے ذریعے ہم خدا سے مدد مانگتے ،اس کے آگے خود کو ڈال دیتے، اپنے عجز کا اظہار کرتے اور اس سے اپنے تعلق کی تجدید کرتے ہیں۔توکل سے ہم اس پر بھروسہ رکھتے ہوئے پر اعتماد رہتے ہیں کہ اس راہ میں شیطان اور نفس کی چالوں کو ہم اللہ کی نصرت سے شکست دے لیں گے۔تفویض کے ذریعے ہم اپنے ناقابل کنٹرول امور کو اللہ کو سونپ دیتے اور آخر میں خدا کی ہر قضا پر راضی رہنے کا عہد کر لیتے ہیں۔

آیئے ہم سب جائزہ لیں کہ ہمارے دل کی بورنگ کے سوتے خشک تو نہیں ہوگئے۔

ہمیں زندگی کے مسائل برے لگتے ہیں مگر
بڑی ترقی بڑے مسائل کے بغیر نہیں ملا کرتی (ابو یحییٰ)

محمد جاوید

ایوارڈز کی آخری تقریب

ہمارے معاشرے میں مختلف ٹی وی چینلز پر نشر کی جانے والی ایوارڈز کی تقریبات بہت مقبول ہیں۔ ایوارڈز کی یہ تقریبات تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ عوام میں عام طور سے زیادہ مشہور تو فلم انڈسٹری سے وابستہ تقریبات ہیں لیکن مختلف کھیل، علوم وفنون اور سماجی خدمات کے حوالے سے بھی علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کثرت سے ایسی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ایوارڈز کی ایسی تقریبات بچپن سے ہی ہماری زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ سکولوں میں ہر سال ہونے والی Prize Distribution Ceremonies اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

ایوارڈز کی ایسی تقریبات جو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منعقد کی جاتی ہیں ان میں جو چیز انتہائی اہمیت کی حامل ہے وہ ان کا شان وشوکت کے مختلف پہلوؤں سے مزین ہونا ہے۔ اسٹیج کو شاندار طریقے سے سجایا جاتا ہے۔ رنگ ونور کا اہتمام ایسا دلفریب ہوتا ہے کہ دیکھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ مہمانوں کی آرام وآسائش کی خاطر طرح طرح کے بندوبست کیے جاتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی کے لیے لذیذ کھانوں اور مشروبات کا وسیع انتظام ہوتا ہے اور پھر انعام جیتنے والوں کی حتمی عزت افزائی کے لیے ان کے شعبے سے وابستہ ایسی قد آور شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے جن کے ہاتھوں سے ایوارڈ پانا بذات خود ایک بڑے اعزاز کے مترادف ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی اچھی خدمت یا کام کے صلے میں اس دنیا میں ایسی کسی تقریب میں ایوارڈ حاصل کرنا بڑی کامیابی ہے لیکن ایک حقیقت جس کا ادراک بہت ضروری ہے وہ یہ کہ ایوارڈ کی ایک ایسی تقریب بھی عنقریب منعقد ہونی ہے جو اپنی شان وشوکت، جمال وکمال اور خوبصورتی اور رعنائی میں بے مثل ہوگی۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ اس کائنات میں ایوارڈز کی

آخری تقریب ہوگی۔ جس کو وہاں ایوارڈ مل گیا وہ ہمیشہ کے لیے باعزت ہوگیا اور جو وہاں ایوارڈ سے محروم رہا وہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں رہ گیا۔

اس دنیا کی ایوارڈز کی تقریبات تک لوگوں کی ایک قلیل تعداد ہی پہنچ پاتی ہے۔ اس دنیا کی بے شمار رکاوٹیں، حادثات، ناموافق حالات اور مجبوریاں بہت سے لوگوں کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر پاتے۔ اس دنیا کی ایسی تقریبات کا عارضی پن بھی واضح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ دنیا میں منعقدہ یہ تقریبات انسانی شرف اور محاسن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر ہی نہیں سکتیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ دنیا میں موجود سارے انسانوں کی صلاحیت کا تجزیہ کر کے یہ بتا سکے کہ کون شخص کس خوبی کی بناء پر کس انعام کا اصل حق دار ہے۔

لیکن اس کے برعکس ایوارڈز کی یہ آخری تقریب تمام علتوں سے پاک ہوگی۔ اس تقریب کی میزبانی اس کائنات کے فیض رساں رب کے ذمے ہوگی اور وہاں کا انتظام اس کے برگزیدہ فرشتوں کے ماتحت ہوگا۔ آرائش و جمال کا جو نظارہ وہاں انسانوں کی آنکھوں کی زینت بنے گا اس کا کوئی ادنیٰ سا موازنہ بھی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی تقریب سے نہیں کیا جا سکتا۔

ایوارڈز کی اس آخری تقریب میں ایوارڈز کی کوئی کمی نہ ہوگی اس لیے کے وہاں جس ذات نے یہ ایوارڈز بانٹنے ہیں اس کے خزانے بھی لامحدود ہیں اور اس کی عطا بھی بے حساب ہے۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ چند سرکردہ لوگوں کو ہی ایوارڈ دیے جائیں گے بلکہ وہاں تو رائی کے دانے کے برابر نیکی بھی میزان میں رکھی جائے گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو عزت و احترام اور شرف و جاہ وہاں ایوارڈ پانے والوں کے حصے آئے گا وہ ابدی اور دائمی ہوگا۔

ایوارڈز کی یہ آخری تقریب جس کے بعد کوئی اور تقریب کبھی نہ ہوگی بہت جلد منعقد ہونے کو

ہے۔اس تقریب کے میزبان کی طرف سے بھیجے گئے جلیل القدر پیغمبر انسانیت کو اس تقریب سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔آخری مرتبہ اس کا اعلان سب سے بڑا پیمانے پر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے،آیئے ہمت کریں۔ ایوارڈز کی اس آخری تقریب میں اپنے لیے ہمیشہ کی عزت اور سرفرازی کے کسی ایوارڈ کے لیے خلوص دل سے کوشش کریں۔دنیا کے ایوارڈز بہرحال عارضی ہوتے ہیں اور ایک لمبی،پیچیدہ اور جان گسل محنت کا تقاضا کرتے ہیں لیکن یقین رکھیں کائنات کی اس آخری تقریب میں ایوارڈ پانا نسبتاً آسان ہے۔قرآن وہاں ایوارڈ پانے کے طریقے کو سادہ لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے۔

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کی خشیت سے ہر وقت ترساں رہتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور وہ لوگ جو دیتے ہیں تو جو کچھ دیتے ہیں اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں خدا کی طرف پلٹنا ہے۔یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان کو پا کر رہیں گے اور ہم کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس ایک رجسٹر ہے جو بالکل ٹھیک بتا دے گا اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔

(سورۃ المؤمنون آیت 58 تا 62)

باصلاحیت	انسانوں کی	قدردانی
اجتماعی کامیابی کا اصل راز	ہے	(ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

ہمارا تعلیمی نظام

قارئین کرام! آج میں آپ سے ایک ایسے اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں جس پر ہماری قوم کے مستقبل کا انحصار ہے اور جس کی اہمیت کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہمارا ماضی نا قابل رشک اور حال مختلف بحرانوں سے عبارت ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے نظام تعلیم کا ہے۔ تاہم اس سے قبل کے میں پاکستان کے تعلیمی نظام کے مسائل پر کوئی بات کروں، گفتگو کے آغاز میں ہمیں مختصراً کچھ اصولی چیزیں سمجھنی ہوں گی۔ ان کو سمجھے بغیر ہمارے اندر اپنے نظام تعلیم کو بہتر بنانے کا کوئی داعیہ پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہماری لیڈرشپ اور عوام اس کو اپنا مسئلہ بنائیں گے۔

انسانی تاریخ کے مختلف مراحل

ہم انسانی تاریخ کے چوتھے دور میں زندہ ہیں۔ انسانی تاریخ کا پہلا دور وہ ہے جس میں انسان شکار کر کے اور پھل وغیرہ چن کر اپنی معیشت کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ اسے شکار کا دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا دور وہ ہے جسے زرعی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس دور میں انسانی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ ان دونوں ابتدائی ادوار کی اہم ترین مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ ان میں افراد، گروہوں اور معاشروں کی قوت و طاقت کا انحصار اصلاً عددی قوت اور جسمانی طاقت پر تھا۔

ان دونوں ادوار میں انسانوں نے حیوانات کو تو بڑی حد تک مسخر کرلیا تھا لیکن فطرت کی طاقتوں اور مادی قوتوں پر اس کو بہت کم قابو ملا تھا۔ علم میں ترقی اس وقت بھی ہوئی تھی، مگر یہ ترقی

کچھ افراد اور محدود عرصے کے لیے کچھ اقوام تک محدود رہی اور اس علم کو تعلیم کی شکل میں اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا باقاعدہ نظام وجود میں نہیں آیا۔ اس لیے جہاں کہیں بھی کوئی علمی ترقی ہوئی وہ اگلی نسلوں اور دیگر اقوام تک منتقل نہیں ہوسکی۔ اس دور میں نظام تعلیم اساتذہ کے حلقہ درس تک محدود تھا اور Academy اور Lyceum جیسے تعلیمی ادارے بھی افلاطون اور ارسطو کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھے اور ان کے بعد اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے۔ یہ مسلمانوں کا اعزاز ہے کہ انھوں نے تاریخ میں پہلی دفعہ علم کو تعلیم کے سانچے میں ڈھالا اور ایک تعلیمی عمل کے ذریعے سے علم کی آگے منتقلی کا اہتمام کیا۔ نظامیہ، مستنصریہ اور الازہر جیسے اعلیٰ تعلیم کے باقاعدہ، منظّم اور سرکاری سرپرستی میں چلنے والے ادارے انسانیت کو مسلمانوں ہی کی دین تھے۔ تاہم مسلمانوں کی عمومی توجہ زیادہ تر دینی تعلیم تک رہی۔ دنیوی علوم میں مسلمانوں نے جو کچھ ترقی کی، اسے نظام تعلیم کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ یہ زیادہ تر انفرادی طور پر مسلم سائنسدانوں تک محدود رہی۔

قرون وسطیٰ میں اہل یورپ کا واسطہ جب مسلمانوں سے پڑا تو انھوں نے نہ صرف نظام تعلیم مسلمانوں سے لیا بلکہ دنیوی سائنسی علم کو بھی نظام تعلیم کا حصہ بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں کچھ ہی صدیوں میں انسانی تاریخ کے تیسرے دور یعنی صنعتی دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں انسان نے مادہ کو ایک شکل سے دوسری شکل میں بدلنا سیکھ لیا اور فطرت کی طاقتوں کو پوری طرح مسخر کر لیا۔ جسمانی اور حیوانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت نے لے لی اور نت نئی ایجادات نے زندگی کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔ اس ہمہ گیر اور تیز رفتار ترقی کے پیچھے کارفرما اصل سبب یہی تھا کہ انسانی سماج نے علم کو تعلیم کی شکل میں اگلی نسلوں تک باقاعدہ منتقل کرنے کا نظام بنا لیا تھا۔ چنانچہ جس جس قوم نے اپنے نظام تعلیم کو اس پہلو سے دیکھا کہ یہ علم کی منتقلی کا ذریعہ ہے وہ تیزی کے ساتھ ترقی کر کے صنعتی دور کی بڑی طاقتوں میں شامل ہوگئی۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے سے انسانی تاریخ کے چوتھے دور یعنی انفارمیشن ایج کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل صنعتی دور ہی کی مزید ترقی یافتہ شکل ہے۔ مگر اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی ترویج کے انتہائی تیز رفتار اور عالمی ذرائع وجود میں آ گئے ہیں۔ جس کے بعد کمزور گروہوں اور اقوام کے لیے یہ موقع پیدا ہو گیا ہے کہ وہ علم میں اپنی کمی کو تیزی کے ساتھ پورا کر کے ترقی یافتہ اقوام کی کی صفوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہ موقع صرف انھی افراد، اقوام اور گروہوں کے لیے ہے جو اس بات کو سمجھتے ہوں کہ نظام تعلیم اصل میں اگلی نسلوں کو علم کی منتقلی کا سب سے منظّم اور موثر ذریعہ ہے۔

پاکستان کا قومی تشخص

یہ وہ پہلی بنیاد ہے جس پر ہماری قوم کو سب سے بڑھ کر اپنے نظام تعلیم کو بہتر بنانے اور اسے اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنانے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی ترجیحات اور بجٹ کا صرف دس فیصد حصہ تعلیم کے لیے وقف کر دیں تو دس سے پندرہ برس میں پاکستان کا شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہونے لگے گا۔ تاہم نظام تعلیم ایک دوسرے پہلو سے پاکستان کے قومی تشخص کی تشکیل کے لیے بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے تقریباً ستر برس بعد بھی ہم ایک قوم نہیں بن سکے۔ کالا باغ ڈیم جیسی بنیادی قومی ضرورت ہو یا چھوٹے صوبوں جیسی اہم انتظامی ضرورت، ہم کہیں اتفاق رائے پیدا نہیں کر پاتے۔ یہاں بھی نظام تعلیم ہی ہمارے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ تاہم اس بات کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ پس منظر جاننا ضروری ہے۔

پاکستان 1947 میں مذہب کے نام پر وجود میں آیا۔ یہ ایک ایسے زمانے میں ہوا جب کہ ہر طرف نیشنل اسٹیٹ کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ یہ نیشنل اسٹیٹ جغرافیہ، تاریخ، زبان اور ثقافت وغیرہ

کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ان بنیادوں پر مسلمانان ہند کے لیے ایک الگ ریاست کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ بانیان پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کا مقدمہ لڑا تو انھوں نے زبان، تہذیب، جغرافیہ اور تاریخ کے بجائے مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا کیس پیش کیا اور اسی بنیاد پر الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تاہم یہ ایک حقیقت تھی کہ مذہب کے نام پر وطن کا مطالبہ خاص ہندوستان کے پس منظر میں تھا۔ذرائع مواصلات کی ترقی کے اس دور میں جب سفر کرنا بے حد آسان ہے، دنیا کے کسی ملک کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی سرحدیں لامحدود طور پر کھول دے۔ چنانچہ آزادی کے وقت پاکستان کی سرحدیں صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کھلیں اور تھوڑے عرصے کے بعد بند کر دی گئیں۔اب نہ تو ہندوستان کا کوئی مسلمان اور نہ کسی اور علاقے ہی کا مسلمان پاکستان کی شہریت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

دوسری طرف جب قیام پاکستان کے وقت صورتحال یہ تھی کہ نہ ملک کا جغرافیہ ایک تھا نہ تاریخ، نہ زبان ایک تھی اور نہ تہذیب و ثقافت۔ چنانچہ جب وطن آزاد ہو گیا اور اس ہندو اکثریت سے براہ راست کوئی تعلق نہ رہا تو وہ سارے تضادات ابھر کر سامنے آ گئے جو ہندوؤں کے غلبے کے اندیشے سے دب گئے تھے۔ایسے میں اس بات کی بے حد ضرورت تھی کہ اس نئی قوم کو ایک نیا قومی تشخص دینے کے لیے فوراً ایک نظام تعلیم دیا جاتا جو اس میں پائے جانے والے لسانی، جغرافیائی، ثقافتی اختلافات کو ایک نئی مشترکہ شناخت میں ڈھالتا۔یوں لوگوں میں ایک قومی وژن، اجتماعی مفاد کا احساس، اپنی ذمہ داریوں کا شعور اور قومی اتحاد کا جذبہ پیدا ہوتا۔ دوسری طرف علم کی وہ روایت بھی آگے منتقل کرتا جو دور جدید میں قوموں کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان میں علم و دانش کی کوئی ایسی روایت نہ تھی جو اس سنگین ترین مسئلے کو سمجھ سکی۔ رہی سیاسی قیادت تو وہ اس سے کہیں زیادہ آسان اور سطحی معاملات کو سمجھنے میں ناکام رہی، کجا یہ کہ وہ اتنی گہری بات کو سمجھ سکتے۔ اس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ آزادی کے پچیس برس بعد ہی ملک کا آدھے سے زیادہ حصہ الگ ہوگیا۔ باقی آدھے کا بھی معاشی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حوالوں سے جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

پاکستان کا موجودہ نظام تعلیم

نظام تعلیم سے متعلق یہ وہ حقیقت ہے جس کا ادراک آج کے دن تک کسی کو نہیں ہوسکا۔ یعنی کسی قوم کی تعمیر ہو یا اس کی ترقی، اس کا تمام تر انحصار نظام تعلیم پر ہے۔ قومی تشخص کی تشکیل ہو یا اس کی نئی نسلوں تک منتقلی، علم و اقدار کی روایت کا احیا ہو یا نئی نسلوں میں ان کی آبیاری؛ ان میں سے ہر چیز کا انحصار قومی نظام تعلیم پر ہوتا ہے۔ یہ بات نہ آج تک کسی سیاستدان کو سمجھ میں آسکی اور نہ کسی مفکر نے قومی نظام تعلیم کی اس اہمیت کو واضح کیا۔ آج بھی ہم تعلیم کو چھوڑ کر انتہائی سطحی چیزوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس برس (2014-15) کے بجٹ میں مجموعی قومی پیداوار کا صرف 2 فیصد تعلیم کے لیے وقف ہے۔ تاہم اس رقم کو تو چھوڑیے تعلیم کے نام پر جو کچھ عملاً ہو رہا ہے اس کے لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ المیہ کا لفظ زیادہ موزوں ہے یا لطیفے کا۔ یہ المیہ یا لطیفہ جو بھی ہے، اس کا جائزہ بھی لے لیتے ہیں کیونکہ یہ پہلے سے تقسیم شدہ قوم میں مزید نت نئی تقسیم کے بیج بو رہا ہے۔

کسی قوم کا قومی نظام تعلیم ابتدائی تعلیم کا نظام ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں بچوں کو لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب، بنیادی سائنسی اور سماجی علوم کے ساتھ ساتھ اقدار، تہذیب روایات اور قومی امنگوں اور نظریات کا سبق سکھایا جاتا ہے۔ بچے نے ذاتی حیثیت ہی میں نہیں قوم کے ایک فرد کے طور پر بھی جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ اسی عمر میں بن جاتا ہے۔ لیکن دیکھیے کہ اس

دور کی تعلیم کے لیے بھی ہمارے ملک میں کتنے نظام تعلیم ہیں جو اپنے اپنے طریقے پر الگ الگ قسم کے لوگ پیدا کر رہے ہیں۔

''چھوٹا'' اسکول سسٹم

ابتدائی تعلیم کا سب سے پہلا نظام تعلیم ''چھوٹا'' اسکول سسٹم ہے۔ اس ''چھوٹا'' اسکول سسٹم میں بچوں کو اسکول ہی نہیں بھیجا جاتا۔ ان کے والدین اپنی غربت کی بنا پر بچوں کو تعلیم کے بنیادی حق سے محروم کر کے کسی دکان، ورکشاپ یا کارخانے میں ''چھوٹے'' کے طور پر بھیج دیتے ہیں جہاں صبح سے لے کر رات گئے تک لگاتار محنت کرنے کے علاوہ معصوم ذہن صرف غلیظ گالیاں، استاد کی ڈانٹ پھٹکار، بے ہودہ گفتگو اور کام میں ڈنڈی مارنے کے طریقے سیکھتا ہے۔ ضرورت کا کچھ حساب کتاب، کچھ گنتی اور برا بھلا نام لکھنے جیسی چیزیں بھی یہی استاد اسے سکھا دیتا ہے۔ بچہ کچھ کام اور ہنر بھی سیکھ لیتا ہے جو مستقبل میں فاقہ کشی سے اسے بچا لیتا ہے اور ماں باپ کو بھی کچھ نہ کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ معاشرے کو سستی، ماہر اور اکثر بے ایمان لیبر مل جاتی ہے۔ مگر قومی تعمیر اور ترقی میں اس ''چھوٹا'' اسکول سسٹم کا حصہ کچھ نہیں۔

تعلیم کا سرکاری نظام

اس کے بعد دوسرا نظام تعلیم سرکاری نظام تعلیم ہے جسے عام طور پر پیلے اسکولوں کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس میں عام طور پر ملک کے غریب اور لوئر مڈل کلاس کے بچے پڑھتے ہیں۔ اس نظام کی کئی خصوصیات ہے۔ پہلی یہ کہ بارہا اس سسٹم کے اسکول اور اساتذہ گھوسٹ ہوتے ہیں۔ اس تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ کاغذی سطح پر اسکول قائم ہوتا ہے، بجٹ جا رہا ہوتا ہے لیکن عملاً کوئی تعلیم نہیں ہوتی۔ جبکہ گھوسٹ اساتذہ کا مطلب یہ ہے کہ اساتذہ اسکول قائم ہوتا ہے، عمارت بھی ہوتی ہے، بچے بھی پڑھنے آتے ہیں لیکن ان کو پڑھانے والے اساتذہ، تنخواہ لینے کے علاوہ

اسکول تشریف نہیں لاتے۔ یا آتے ہیں تو کلاس میں نہیں جاتے اور جانا پڑے تو دن میں ایک آدھ گھنٹے کلاس میں جا کر تھوڑا بہت پڑھا لیتے ہیں۔

اس سسٹم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کرپشن گورنمٹ کے دوسرے اداروں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ملازمت انھی کو ملتی ہے جو پیسے دے کر ملازمت خرید سکیں۔ ایسے لوگ اکثر نااہل ہوتے ہیں اور اچھی تنخواہ، مراعات اور سہولیات کے باوجود ان میں طلبا کو پڑھانے اور سکھانے کی کوئی صلاحیت ہوتی ہے نہ خواہش۔ جس طرح باقی سرکاری محکموں کے ملازمین وقت گزاری کرتے ہیں، یہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔۔ یہاں میرٹ کے بجائے رشوت کی بنیاد پر ترقیاں مل جاتی ہیں اور اس طرح ترقی پا کر ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس بننے والے اسکول کے بجٹ کا بڑا حصہ خرد برد کر کے کھا جاتے ہیں۔ اسکول کا ڈسپلن اور طلبا کی بہتر تعلیم و تربیت بھی ان کا مسئلہ نہیں بن پاتی۔

اس سسٹم کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بچے سیکھنے کے بجائے سوالوں کے جواب رٹ کے اگلے درجہ میں پہنچتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں نہ وہ حقیقی معنوں میں کچھ سیکھ پاتے ہیں اور نہ ان کی سیکھنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک اچھا نصاب ہونے کے باوجود یہ نظام تعلیم اچھے شہری پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

مزید یہ کہ یہ سسٹم باصلاحیت بچوں کے مقتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اول تو یہاں آتے ہی غریب بچے ہیں جن کے والدین جلد یا بدیر بچوں کو اسکول سے نکال کر ''چھوٹا'' اسکول سسٹم میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ یہ نہ بھی کریں اور خود ساری مشقت جھیل کر بچوں کو پڑھائیں تب بھی مذکورہ بالا صورتحال میں کیسے کسی بچے کی کوئی صلاحیت پنپ سکتی ہے۔ نصیب سے کوئی باصلاحیت اور اچھا استاد یہاں آجائے تو اس سبجیکٹ کی حد تک بچہ کچھ سیکھ لیتا ہے، مگر مجموعی طور پر اس کے سیکھنے کا

عمل اتنا کم ہوتا ہے کہ میٹرک انٹر کر بھی لے تو اعلیٰ تعلیم کے مشکل مراحل سے نمٹنے کی کوئی صلاحیت اس میں نہیں ہوتی۔ جس کے بعد بغیر صلاحیت کے ملازمت کے امیدواروں کی ایک طویل قطار کے سوا معاشرے کو کچھ نہیں ملتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ہر طرح کے حالات کے باجود اپنی جگہ بنا لیتے ہیں، مگر یہ استثنائی مثالیں ہوتی ہیں۔

انگلش میڈیم سسٹم

اس کے بعد وہ نظام تعلیم آتا ہے جسے پرائیوٹ یا انگلش میڈیم سسٹم کہتے ہیں۔ یہ سسٹم خود تین طرح کے ذیلی سسٹم پر مشتمل ہے۔ایک وہ انگریزی اسکول جو ہر گلی محلے میں کھلے ہوتے ہیں اور ان کی فیس اتنی ہوتی ہے کہ لوئر اور لوئر مڈل کلاس گھرانے برداشت کر لیتے ہیں۔ بہت سے مڈل کلاس گھرانے بھی اپنے بچوں کو ایسے ہی اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ان اسکولوں کا نام انگریزی میں ہونے کے علاوہ معیار تعلیم بھی پیلے اسکولوں سے بہتر ہوتا ہے۔نصاب میں انگریزی زبان اور کتب کا اہتمام ہوتا ہے تاہم اساتذہ زیادہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے اس لیے بچے انگریزی بولنا تو دور کی بات ہے لکھنے اور پڑھنے میں بھی ماہر نہیں ہوتے۔ یہاں کے پڑھے ہوئے بچے عام طور پر آٹھویں جماعت کے بعد سرکاری بورڈ ہی سے میٹرک اور انٹر کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اسکول آتے ہیں جو ترقی کر کے بڑے بڑے اسکول سسٹم بنا لیتے ہیں اور ایک شہر کے کئی حصوں بلکہ کئی کئی شہروں میں ان کی برانچ ہوتی ہے۔ان کی فیس اتنی ہوتی ہے کہ اپر مڈل کلاس اور کچھ مڈل کلاس والے بھی افورڈ کر لیتے ہیں۔ یہاں تعلیم اور اساتذہ کا معیار پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ عام طور پر اساتذہ گریجوٹ اور ماسٹرز ہونے کے علاوہ بچوں کی تعلیم کے لیے خصوصی طور پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔زیادہ بڑی کلاسوں میں یہ اپنے اپنے سبجیکٹ کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں پڑھنے والے بچے انگریزی بولنے کی نہ سہی مگر پڑھنے اور لکھنے کی مکمل قابلیت

پیدا کر لیتے ہیں۔ نیز اپنے سبجیکٹ پر بھی ان کو عبور ہو جاتا ہے۔ یہ بچے میٹرک اور انٹر سسٹم کے بجائے اولیول اور اے لیول کا امتحان دیتے ہیں۔

تیسری قسم کے اسکول دراصل ایلیٹ کلاس کے اسکول ہوتے ہیں جن کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں ملک کی اشرافیہ کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ان کا نصاب ،طریقہ تعلیم، ماحول اور پس منظر ہر چیز باقی انگلش میڈیم سے جدا ہوتی ہے، گرچہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے بچے عام طور پر فر فر انگریزی بول سکتے ہیں اور بارہا اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔

یہ تین طرح کے اسکول انگلش میڈیم ہی کہلاتے ہیں۔مگر ان میں پڑھنے والے، ان کا طبقاتی اور مالی پس منظر، پڑھائی کا ماحول اور نصاب اور ان کی منزل اور مستقبل سب جدا ہوتے ہیں۔ خاص کر تیسری قسم کے انگلش اسکول کے بچوں کا باقیوں سے کوئی تعلق اور موازنہ نہیں ہو سکتا۔

دینی مدارس

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عمومی تعلیم کا کوئی نظام نہیں بلکہ دین کے عالم تیار کرنے کا نظام ہے۔ یہ ایک اور قسم کا مکمل نظام تعلیم ہے جس کی اپنی دنیا اور اپنی تقسیم ہے۔ پہلے اس کی تقسیم پر بات کر لیتے ہیں۔ یہاں تین قسم کی بنیادی تقسیم پائی جاتی ہے۔ سنی اور شیعہ تقسیم، مقلد و اور غیر مقلد کی تقسیم اور بریلوی اور دیوبندی تقسیم۔

سنی شیعہ کی تقسیم سے سب واقف ہیں۔ یہ صدیوں سے چلی آرہی ہے اور آج تک موجود ہے۔اس میں اہل تشیع کے مختلف گروہ یعنی اثنا عشری، آغا خانی اور بوہری ایک طرف ہیں اور دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث دوسری طرف۔ دوسری تقسیم مقلدین اور غیر مقلدین کی ہے۔ غیر مقلدین سے مراد اہل حدیث حضرات ہیں جو کسی خاص امام کے فقہی مذہب کی تقلید کو درست

نہیں سمجھتے جبکہ مقلدین میں دیوبندی اور بریلوی حضرات شامل ہیں جو حنفی فقہ کی پیروی کو لازمی سمجھتے ہیں۔ تیسری تقسیم میں ایک طرف بریلوی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیر و مشائخ کے مزارات سے متعلق کچھ خاص تصورات میں دیوبندیوں اور اہل حدیث حضرات سے بہت الگ جگہ کھڑے ہیں۔ دیوبندی حضرات تصوف اور پیروں کے قائل ہیں جبکہ اہل حدیث کے ہاں اس تصور کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔

ہر گروہ کے علماء اپنے مدارس کھولتے ہیں۔ ان مدارس میں زیادہ تر دیہاتی اور غریب پس منظر کے وہ بچے آتے ہیں جن کے والدین کے زیادہ بچے ہوتے ہیں۔ کچھ بچوں کو وہ مدرسے بھیج دیتے ہیں جہاں ان کے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ پڑھ لکھ کر وہ عالم بھی بن جاتے ہیں اور کسی مسجد یا مدرسے میں اپنے روزگار کا ذریعہ پیدا کر لیتے ہیں۔

اس سسٹم کی خصوصیات میں سب سے نمایاں یہی ہے کہ یہاں سے اسلام کے نہیں مخصوص فرقوں کے علماء نکلتے ہیں۔ یہاں کا بریلوی عالم بریلوی رہتا ہے، دیوبندی دیوبندی رہتا ہے، اہل حدیث اہل حدیث رہتا، شیعہ شیعہ اور سنی سنی رہتا ہے۔ یہ نہ ایک دوسرے کی بات سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں اور اکثر ایک دوسرے کے پیچھے نماز کو درست بھی نہیں سمجھتے۔ پیچھے جس طبقاتی تقسیم کا ذکر ہوا ہے یہ اس میں مزید فرقہ وارانہ تقسیم کو بڑھا دیتے ہیں۔

اس سسٹم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چھوٹے بچوں کو ابتداء ہی سے علما بننے کے عمل میں لگا دیا جاتا ہے۔ یوں یہاں کے فارغ التحصیل علماء بارہ برس کے اس عمومی نظام تعلیم کا حصہ نہیں ہوتے جس سے باقی قوم برا بھلا جیسے بھی ہو گزرتی ہے۔ اس طرح ایک طرف قوم کے اندر تقسیم در تقسیم کا عمل بڑھتا بلکہ وہ علماء جن کا کام معاشرے کی رہنمائی کرنا ہے، ان کے اور معاشرے کے درمیان ایک مستقل کمیونیکیشن گیپ پیدا ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک چھوٹے بچے

کو نہ اپنے ذوق کا پتہ ہوتا ہے نہ اس کا کوئی رجحان سامنے آتا ہے، مگر اس سے قبل ہی یہ نظام اسے عالم دین بنا چکا ہوتا ہے۔ جبکہ قدرت ہر شخص کو عالم بننے کے لیے پیدا نہیں کرتی۔ کوئی تاجر ہوتا ہے، کوئی شاعر و ادیب ہوتا ہے، کوئی کھلاڑی ہوتا ہے اور کوئی سائنسدان اور انجینیر۔ ایک عام بچہ بارہ برس کی عمومی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک طرف معاشرے کی مین اسٹریم کا حصہ بن چکا ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق اپنی پسند کی فیلڈ کا انتخاب کرتا ہے۔ مثلاً وہ ڈاکٹری میں دلچسپی رکھتا ہے تو پھر ایم بی بی ایس کرتا ہے۔ یوں نہیں ہوتا کہ بچپن سے اس کے والدین اسے ڈاکٹر بنانے کے کالج میں بٹھا دیتے ہیں۔ کوئی بچوں کو اس طرح ڈاکٹر یا انجینیئر بنانے کے کالج کھولتا بھی نہیں۔ مگر مذہبی عالم بنانے کے لیے ہمارے معاشرے نے یہی اختیار کر رکھا ہے۔

اس کے نتیجے میں ایک طرف یہ بچے اپنے ذوق کے کام سے دور رہتے ہیں تو دوسری طرف ایک جدید دنیا میں جہاں اسلام کو طرح طرح کے چیلنجز درپیش ہیں دین کی نمائندگی کے لیے ایسے لوگ سامنے آتے ہیں جو طبعاً عالم اور محقق ہوتے ہی نہیں۔ بلکہ زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ ان کی زندگی کا اصل مقصد اپنے فرقے کی حقانیت ثابت کرنا ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں بھی مستثنیات پائی جاتی ہیں۔ ایسے اہل علم ہیں جو فرقہ واریت اور انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ جدید دنیا اور علوم کو سمجھتے ہیں اور جدید لوگوں سے ان کی زبان اور محاورے میں گفتگو کر کے ان کے شبہات کا ازالہ کر سکتے ہیں، مگر کوئی نظام تعلیم اپنی مستثنیات کی بنیاد پر نہیں عمومی پروڈکٹ کی بنیاد پر پہچانا جاتا ہے۔ یہ پروڈکٹ ہر گلی کوچے میں موجود مسجد میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں مسجد کے باہر واضح طور پر فرقہ کا نام لکھا ہوتا ہے۔

مسئلے کو تسلیم کیجیے

یہ وہ پس منظر ہے جس میں اپنے قومی تشخص کی تلاش میں بھٹکتی پاکستانی قوم صوبائی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کے ساتھ ساتھ زبردست قسم کی طبقاتی اور مذہبی تقسیم کا شکار بھی ہوچکی ہے۔ جس ملک میں پہلے پانچ قومیں تھیں جن میں سے ایک الگ ہوگئی اور چار رہ گئیں وہاں نظام تعلیم کی اہمیت کو نہ سمجھنے کی بنا پر اب ایک درجن قومیں اور گروہ بن چکے ہیں جن کے مفادات، نظریات اور خیالات سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مزید یہ کہ دنیا میں جب ہر قوم تیزی سے ترقی کررہی ہے اور بنگلہ دیش جیسا ملک پاکستان سے آگے نکل گیا ہے، ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم سے غلطی کہاں ہورہی ہے۔ ہم سے غلطی اپنے نظام تعلیم کے معاملے میں ہورہی ہے۔ اسی بنا پر ہم دنیا میں حقیقی ترقی نہیں کرپارہے۔ اس سے بڑھ کر قومی سطح پر ہماری تقسیم کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں پاکستان کے باشعور اذہان اور دردمند لوگوں کو اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ یہ حل کی طرف پہلا قدم ہے۔ یعنی مسئلے کا شعور پیدا کیا جائے۔ مسئلے کو مسئلہ مانا جائے۔ اس مسئلے سے پیدا ہونے والے برے نتائج کو تسلیم کیا جائے۔ اس کے بعد ہی کسی حل کی بات اپنی کوئی جگہ بناسکے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علمی اور فکری حلقوں میں اس پر بحث ہو۔ میڈیا اور سیاست دان کبھی حالات حاضرہ سے بلند نہیں ہوسکتے۔ جبکہ تعلیم حالات حاضرہ کا موضوع نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق پندرہ بیس سال کے مستقبل سے ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت کرنٹ افیرز میں جینے والوں میں نہیں ہوتی کہ وہ اتنی دور کی سوچ سکیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آج ہم نے اس مسئلے پر سوچنا شروع نہیں کیا تو اگلے پندرہ بیس برس ہمارے لیے بہت سنگین مسائل لے کر آئیں گے۔ وہ مسائل جن کو حل کرنا شاید کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (15)

دلائل آخرت: جوڑے کی دلیل

دلیل مقصدیت اور جوڑے کی دلیل

پچھلی قسط میں ہم نے آخرت کے اثبات میں قرآن مجید کی دلیل مقصدیت پر گفتگو کی تھی۔ مقصدیت کی دلیل کا خلاصہ یہ تھا کہ اس دنیا کی تمام فطری قوتیں اس مقصد کے لیے وقف معلوم ہوتی ہیں کہ دھرتی پر زندگی کو وجود میں لایا جائے۔ زمین و آسمان کی ہر شے زندگی کی سب سے اعلیٰ قسم یعنی انسان کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ لیکن خود انسانی زندگی جن حوادث سے دوچار ہوتی ہے، اس کے بعد یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خود زندگی اور انسان کی چند برسوں پر مشتمل اس زندگی کا کیا مقصد ہے۔ کیا اتنی بامعنی زندگی کا اپنا کوئی مقصد نہیں؟ اس کے پیچھے کوئی حکمت اور مصلحت نہیں؟ قرآن مجید یہ واضح کرتا ہے کہ زندگی اور موت کے اس پورے سلسلے کا مقصد انسان کی آزمائش اور امتحان ہے۔ جلد قیامت آئے گی جو اس امتحان کے نتیجے کا دن ہوگا اور اس دن جو دنیا قائم ہوگی وہ ابدی سزا و جزا کی دنیا ہوگی۔ یہی وہ آنے والی دنیا جس کے ساتھ ملا کر موجودہ دنیا اور اس میں جیتے مرتے انسانوں کو دیکھا جائے گا تو زندگی کی مقصدیت واضح ہوگی ورنہ زندگی اپنے مقصد کی تلاش میں رہبانیت، تشکیک اور غفلت کی راہوں میں بھٹکتی پھرے گی۔

یہ بات انتہائی معقول اور فطری ہے، مگر اس پر بنیادی اعتراض یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اِس دنیا کی بنیاد پر آنے والی دنیا کی بات کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے۔ یہی وہ مقام

ہے جہاں سے آخرت کی وہ پانچویں دلیل پھوٹتی ہے جسے قرآن مجید اپنے مخاطبین کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ انسانوں کی توجہ اس دنیا میں موجود چارسو پھیلی فطرت کی نشانیوں کی طرف دلا کر یہ واضح کرتا ہے کہ غور کرو اس دنیا کی ہر چیز جوڑے جوڑے کے اصول پر پیدا کی گئی ہے۔ یہاں ہر چیز تنہا تنہا اپنا وجود رکھتی ہے، مگر اپنا مقصد تخلیق وہ اُسی وقت پورا کرتی ہے جب اسے اس کے جوڑے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔

جوڑں کی شکل میں تخلیق کی مثالیں

اس بات کو سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں خود انسان کا اپنا وجود اس جوڑا بندی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اس دنیا میں اگر صرف مرد ہوں یا صرف عورتیں تو نسل انسانی ایک صدی کے اندر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ مگر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نئی زندگی کی بنا پڑتی ہے۔ کم وبیش تمام حیوانات کا یہی معاملہ ہے جو نر اور مادہ کے جوڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ نر و مادہ ملتے ہیں اور نئی زندگی وجود میں آجاتی ہے۔

یہ معاملہ انسان و حیوان تک محدود نہیں۔ یہی عالم نباتات میں ہوتا ہے۔ یہ عالم جمادات میں ہوتا ہے۔ اسی اصول پر عالم اکبر (Macro World) قائم ہے اور اسی پر عالم اصغر (Micro World) چلتا ہے۔ ہر چیز اسی اصول پر زندہ ہے اور اپنے مقصد حیات کی تکمیل کرتی ہے۔ چند مثالوں سے اس بات کو سمجھتے ہیں۔

پودوں کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں نر و مادہ کا فرق نہیں ہوتا۔ لیکن علم نباتات پر گہری نظر رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ پودوں میں نر و مادہ کا تصور پوری طرح

موجود ہے۔ بعض اوقات یہ نر اور مادہ عناصر ایک ہی درخت پر پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات نر و مادہ پھول الگ الگ درختوں پر ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کو Monoecious اور دوسری کو Dioecious کہتے ہیں۔ یہ بات ایک عام مثال سے بھی یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ پپیتے کا بیج اگر آپ اپنے گھر میں لگائیں تو چھ مہینے بعد ہی وہ پھل دینے لگتا ہے۔ مگر بعض اوقات اس پر پھل نہیں آتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ جس پر پھل آئیں وہ مادہ درخت ہوتا ہے اور جس پر نہیں آتے وہ نر درخت ہوتا ہے۔

قرآن مجید اس عالم سے دن اور رات، زمین و آسمان، چاند اور سورج، پہاڑ اور دریا کے جوڑوں کو اسی اصول پر پیش کر کے یہ بتاتا ہے کہ یہی خدا کا طریقہ تخلیق ہے۔ اگر دنیا میں صرف دن کی روشنی ہو اور رات کا اندھیرا نہ ہو، زمین کی زرخیزی ہو اور بارش برساتا آسمان نہ ہو، حرارت دینے والا سورج ہو اور راتوں کو نور دینے والا چاند نہ ہو، پہاڑ کی بلندی اور ان پر جمی برف ہو مگر انھیں پانی کی شکل میں لے کر بہنے والے دریا نہ ہوں تو یہ دنیا باقی نہیں رہ سکے گی۔ ان میں سے ہر جوڑے کے دو ارا کین مل کر اپنا مقصد تخلیق پورا کرتے ہیں۔ یہ عالم اکبر ہے جبکہ آج ہم جانتے ہیں کہ عالم اصغر میں کائنات جن ایٹموں سے مل کر بنی ہے ان کے الیکٹرون پر منفی اور پروٹان پر مثبت برقی چارج ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی تخلیق کا معاملہ ہے اور یہی معاملہ اس کے کلام کا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق معلوم ہے کہ اس کی آیات سورتوں کی شکل میں منظّم ہیں۔ تاہم یہ تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ امام فراہی اور ان کے تلامذہ نے قرآن مجید کی ہر سورت پر کام کر کے یہ بتادیا ہے کہ یہی قرآن مجید کا عمومی طریقہ ہے کہ ہر سورت اپنے ساتھ والی سورت سے مل کر ایک جوڑا بناتی ہے اور یہ جوڑا ہی ایک مکمل پیغام واضح کرتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال جس کو عام لوگ بھی جانتے ہیں وہ معوذتین یعنی سورہ فلق اور سورہ ناس ہیں۔ تاہم قرآن مجید میں بعض

سورتیں جوڑے کے بغیر ہیں۔ جس کی ایک مثال خود سورہ فاتحہ ہے جس کا کوئی جوڑا نہیں۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کائنات میں بھی بعض چیزیں استثنائی طور پر جوڑے کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا عمومی طریقہ تخلیق یہی ہے۔

جوڑوں کی شکل کی یہی تخلیق اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ یہ دنیا اگر ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر اپنے ناتمام ہونے کا اعلان کر رہی ہے تو لازماً اس کا ایک جوڑا بھی ہونا چاہیے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کو جوڑا آخرت ہے۔ یہ دنیا عارضی اور آخرت ابدی ہے۔ یہ دنیا امتحان کا اور آخرت سزا و جزا کا مقام ہے۔ یہ دنیا کام کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کام کا نتیجہ دیکھنے کی جگہ ہے۔

قرآنی بیانات

اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں! اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو (سورۃ ذاریات 51: 47 تا 49)

پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود اِن کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں (سورۃ یسین 36:36)

درج ذیل آیات کی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ ان میں پہلے آسمان کو لیا گیا اور اس میں موجود سورج اور چاند کے جوڑے کا ذکر ہے۔ پھر آسمان کے اس جوڑے کے اگلے جز یعنی زمین کو لے کر اس میں دریا اور پہاڑ، دن اور رات اور پھلوں کے جوڑوں کا ذکر کیا گیا۔ ان سب سے مقصود آخرت کا یقین پیدا کرنا بیان کیا گیا ہے۔

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین کے لیے

گردش کرتا ہے۔ وہی کائنات کا انتظام فرماتا ہے اور اپنی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

اور وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں کی دو دو قسمیں اس میں پیدا کیں۔ وہ رات کو دن پر اڑھا دیتا ہے۔ بے شک ان چیزوں کے اندر ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کریں۔ (سورۃ الرعد 13: 3-2)

شاہد ہے آفتاب اور اس کا چڑھنا اور چاند جب اس کے پیچھے لگے اور دن جب اسے چمکا دے اور رات جب اسے ڈھانک لے اور شاہد ہے آسمان اور جیسا کچھ اس کو اٹھایا اور زمین اور جیسا کچھ اس کو بچھایا اور نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔ (الشّمس 91:10-1)

شاہد ہے رات جب کہ چھاتی ہے اور دن جب کہ چمک اٹھتا ہے اور شاہد ہے نر و مادہ کی آفرینش کہ تمھاری کمائی الگ الگ ہے۔ سو جس نے انفاق کیا اور پرہیز گاری اختیار کی اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم ڈھیل دے دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔ (الیل 92:10-1)

[جاری ہے]

بنت عتیق/ ابو یحییٰ

خوشی میں صبر

سوال: السلام علیکم

محترم، دکھ، غم، مصیبت اور تنگی میں تو صبر کرنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن خوشی میں کس طرح صبر کیا جائے؟ اس پر تھوڑی روشنی ڈال دیجیے۔ شفقت

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دراصل بات یہ ہے کہ صبر محض غم برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ ہر طرح کے حالات میں اپنے موقف اور عمل پر جمے رہنے کا نام ہے۔ اور عام مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ آسانی اور خوشی کے دنوں میں خُدا کو اس طرح یاد نہیں رکھتے جیسے مشکل اور تنگی میں اسے پُکارتے ہیں۔ خوشی کی کیفیات میں کھو کر یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ یہ آسودہ حالی، یہ مسرت کس کی عطا کردہ ہے، اور یوں اکثر فرائض اور دیگر اعمال میں غفلت برتنے لگتے ہیں۔ اس لیے خوشی میں صبر، دراصل شکر اور خدا کی یاد میں پوشیدہ ہے۔ اپنے جذبات کو قابو میں رکھا جائے اور کوئی عمل خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے۔ آسودگی کو اس کی عطا سمجھ کر دل جھُکا رہے اور زبان پر الحمدللہ کا ورد رہے۔

ایمان کے بعد کفر

سوال: السلام وعلیکم!

قرآن پاک میں منافقین کے بارے میں فرمایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا -اس کا کیا مطلب ہے؟ آج کل کا منافق کون ہو گا؟

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترم آپ نے قرآن پاک کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ سورہ توبہ کی آیت نمبر 74 ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ اپنے اسلام کے بعد کافر ہوگئے۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشارہ اس استہزا اور تمسخر کی طرف ہے جس کے ساتھ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام و آیات کا ذکر اپنی نجی مجالس میں کیا کرتے تھے۔ یہ منافقین دراصل وہ لوگ تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کے بعد اسلام کے اظہار پر مجبور تو ہوگئے، مگر ان کے دل کبھی ایمان نہیں لائے تھے۔ آیہ مبارکہ میں ان کے لیے ایمان کے بجائے ان کے اسلام کا ذکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی امتحان کا وقت آیا تو وہ لوگ دین کے مطالبات پر کبھی پورے نہ اترے۔ اپنے نفاق کی بنا پر وہ دنیا کے عارضی مفادات کے پیچھے اللہ اور اس کے رسول کی حکم عدولی کرنے لگے۔ اور اس پر شرمندہ و نادم ہونے کے بجائے توجہ دلانے پر بہانے تراشتے اور جھوٹی قسمیں کھاتے۔ مگر اللہ نے ان کے نفاق پر مبنی اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

آج کے دور میں بھی ایسے منافقین موجود ہوں گے جنہیں اپنے ایمان کی تشہیر اور دکھاوے کے سوا اس کے مطالبات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں مگر اپنے اعمال کی اصلاح کبھی نہیں کرتے۔ لیکن آج ہم کسی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر نہیں کر سکتے کہ وہ انجانے میں غلطی پر ہے یا قصداً اور جانتے بوجھتے ہوئے یہ روش اختیار کیے ہوئے ہے۔ کیونکہ نیتوں کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن فیصلہ کریں گے۔ ہم کسی فرد یا گروہ کے بارے میں ایسی کوئی بات کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ آپکا حامی و ناصر ہو۔

فرح رضوان

بچوں کا نادیدہ مدرسہ

جس طرح مائکرو ویو اون میں آگ دکھتی نہیں لیکن کھانا گرم ہو جاتا ہے، یا انٹرنیٹ خود تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کے ذریعے سے، ایک دنیا دیکھی جا سکتی ہے، بالکل اسی طرح ہمارے بچوں کا ایک نظر نہ آنے والا اسکول ہوتا ہے۔ یہ نہ اردو میڈیم ہوتا ہے نہ انگلش اور نہ اس کے مخصوص اوقات یا نصاب مقرر ہیں، بس زندگی کے بنتے بگڑتے ڈوبتے ابھرتے حالات میں جو بھی مثبت یا منفی رویہ ہمارا ہو، وہی ان کا مدرسہ ہوتا ہے۔

ہمارے یہی رویے بچوں کے ذہنوں میں ہمیں ہیرو یا زیرو بناتے ہیں، اور خود ان کی شخصیت کو emotional intelligence کے ہنر سے لیس یا اس سے محروم کر دیتے ہیں۔ ایک بچہ جب ذرا سمجھدار ہوتا ہے تو اسے دنیا کا علم سکھانے اسکول میں داخل کروا دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی دینی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اٹھتے بیٹھتے تہذیب و آداب کی تعلیم اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کاج کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، یہ سبھی کچھ انہیں پختہ ارادے اور خوب محنت کے ساتھ سکھایا جاتا ہے اور وہ سیکھتے کتنا ہیں؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ جاننا کافی ہوگا کہ آپ ان سے یہ سوال، دن میں کتنی بار کس کس انداز میں پوچھتے ہیں کہ ''آخر کس زبان میں تمہیں بات سمجھ آئے گی؟''

لیکن جہاں بچہ بات زبان سے نہیں بلکہ والدین کے عمل سے سیکھ رہا ہو اور انسان ہونے کے ناطے جانے انجانے کچھ لغزشیں والدین سے بھی ہو جائیں، تب ہم دل سے چاہیں بھی کہ کاش ہماری فلاں بات بچے نہ سیکھیں یا نہ سیکھتے، لیکن تب ان کے سیکھنے کی صلاحیت دگنی سے زیادہ تیز دکھائی دیتی ہے۔ عموماً سبھی والدین بچوں کی موجودگی میں اچھے اخلاق و کردار پیش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن اصل امتحان تو کسی آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

آپس میں نا اتفاقی ہو جانے پر دوسرے حریف کو ہرانے سے ہی آپ کی ذہنی تسکین ہوتی ہے؟ یا آپ ہار کر دل جیت لینے میں کمال رکھتے ہیں؟ لوگوں کے کام آنے کا موقع ملے تو ان کے پیٹھ پیچھے

غیبت یا منہ پر طعنہ دے کر احسان جتاتے ہیں یا انکساری کے ساتھ نیکی کر دریا میں ڈال کا معاملہ ہوتا ہے؟ جب کسی کم حیثیت انسان سے آپ کا کوئی نقصان ہو جائے تو آپ اپنا غصہ اس پر کس کس طرح نکالتے ہیں اور جب کوئی زورآور آپ کا حق دبا لے، تو آپ اس کی پیٹھ پیچھے اسے کس زبان میں یاد کرتے ہیں؟ آیا ہر کسی سے اپنی بے کسی کی فریاد کرتے ہیں، یا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے اسی کو یاد کرتے ہیں؟

معاملہ فہمی یا دانش مندی کی آڑ میں کس قدر جھوٹ یا مبالغے یا خوشامد سے کام لیتے ہیں۔ مہمانوں کے رہتے میں اور ان کے رخصت ہونے کے بعد ان کے بارے میں آپ کے تبصرے کیا ہوتے ہیں؟ اچانک اپنی یا کسی اپنے کی بیماری کا سن کر آپ کا رویہ ہیجان خیز ہو جاتا ہے یا مسبب الاسباب پر ایمان اور حتی المقدور اسباب کا انتظام کرتے ہیں؟ مالی تنگی آ جانے پر آپ بات بات پر سیخ پا ہو جاتے ہیں؟ قرض لیتے ہیں؟ یا کم میں گذارہ کر کے مطمئن اور با اعتماد رہتے ہیں؟ کسی سانحے پر بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں؟ رنج والم کو رو رو کر بیان کرتے ہیں یا اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا سبق دیتے ہیں؟ کسی دوسرے کے مال واولاد یا پوزیشن میں ترقی کی خبر پر، آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ آیا اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر واقعی راضی رہتے ہیں؟ یا انہیں منہ دیکھی مبارک دیتے ،لیکن دل میں تنگی محسوس کرتے اور یاسیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ کسی کے دعوت میں نہ بلانے پر اس کی خوب خبر لیتے ہیں؟ اگلی بار اس سے بدلہ لے لیتے ہیں یا معاملہ فہمی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ نجی محفلوں میں، اخلاقی سطح، نقطۂ انجماد سے گر جاتی ہے یا بردباری کا دامن تھامے رکھتے ہیں؟

زندگی میں لمحہ لمحہ آپ کے طے کردہ یہ تمام تر معاملات صرف کراماً کاتبین ہی نہیں لکھ رہے ہوتے بلکہ گھر میں موجود، بظاہر کھیلتے ، پڑھتے ،گپیں لگاتے آپ کے ہر عمر کے بچے تمام وقت اپنے اندر جذب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ صرف بداخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہوں تب ہی بچوں کے ذہن میں آپ ایک تلخ، سخت گیر اور ناپسندیدہ انسان بن کر رہ جائیں گے بلکہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین اپنی کسی کمزوری یا بہت نرم دلی اور اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے کوئی معاملہ کریں تب بچوں کے ذہن آپ کی حکمت کو سمجھ نہیں پائیں اور وہ اپنے ذہن کے مطابق آپ کو ناسمجھ، بزدل یا کمزور سمجھ بیٹھیں۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (19)

دوسری اور تیسری جھیل کا رنگ ہلکا سبز تھا۔ دوسری جھیل پر درختوں کی شاخیں لٹک رہی تھیں جن سے دھوپ چھن چھن کر پانی پر پڑ رہی تھی۔ پہلی جھیل پر جانے کے لئے ایک ٹریک بنا ہوا تھا۔ ہم اس پر چل پڑے۔ پانچویں جھیل پر پہنچے تو یہ کچھ خاص محسوس نہ ہوئی۔ پوری جھیل سبز رنگ کے الجی نما پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اب ہم واپس دوسری جھیل سے ہوتے ہوئے تیسری جھیل کی طرف آئے۔ یہ ان تمام جھیلوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ جھیل کے چاروں طرف گھنا سبزہ تھا جس کے عکس کے باعث جھیل کا رنگ بھی سبز ہو رہا تھا۔ دھوپ پانی پر پڑ کر منعکس ہو رہی تھی۔

اب ہم چوتھی جھیل کی جانب بڑھے۔ یہ ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ اس کے بعد پانچویں جھیل کچھ فاصلے پر تھی۔ اس کے قریب کیمپنگ ایریا بنا ہوا تھا۔ میں ساتھ ساتھ جھیلوں کی تصاویر لے رہا تھا۔ پہلی تین جھیلوں کی تصاویر بے حد خوبصورت آئیں حالانکہ جھیلیں اتنی خوبصورت نہیں تھیں۔ اس میں میرا نہیں بلکہ یہ ڈیجیٹل کیمرے کا کمال تھا۔ اس ایجاد کی بدولت ہم جیسے اناڑی فوٹوگرافر بھی اچھی تصاویر لے لیتے ہیں۔ جو منظر اچھا لگا، کیمرے کا رخ اس کی طرف کر کے بٹن دبا دیا۔ تین چار تصاویر میں سے جو خوبصورت آ گئی، اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پانچویں جھیل کی کوئی تصویر خوبصورت نہیں آ سکی۔ اس وجہ سے میں پینو رامیو پر موجود سلجوق صاحب کی دی ہوئی تصویر پیش کر رہا ہوں۔

پانچویں جھیل پر موجود کیمپنگ سائٹ میں دو خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہاں ایک ترک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ ان سے سلام دعا کرنے کی کوشش کی۔ تعارف ہوا مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہمارے پاکستانی ہونے کا سن کر بڑے خوش

ہوئے۔

اب ہم جھیل کی جانب جا رہے تھے۔ اچانک پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ جھیل میں ایک تیز رفتار چشمہ آ کر گر رہا ہے۔ یہاں پانی کا نظام یہی تھا۔ بارش اور چشموں کا پانی پہلی جھیل میں اکٹھا ہوتا ہے۔ جب یہ جھیل بھر جاتی ہے تو اس کا فالتو پانی ایک چشمے کی صورت میں دوسری، وہاں سے تیسری، چوتھی اور پانچویں جھیل میں آ گرتا ہے۔ پانچویں جھیل سے یہ پانی ایک زیر زمین راستے کے ذریعے چھٹی جھیل اور وہاں سے ساتویں تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد فالتو پانی ایک نالے کی صورت میں نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔فضا میں ہلکی سی خنکی تھی۔

کیمپنگ ایریا میں حکومت نے لکڑی کی میزیں اور بنچ رکھے ہوئے تھے۔ایک جانب باربی کیو کرنے کے لئے چولہا بنا ہوا تھا۔اس میں کوئلے اور لکڑیاں ڈال کر سیاح باربی کیو کر سکتے تھے چنانچہ وہ ترک فیملی یہی کر رہی تھی۔ گوشت کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیل رہی تھی۔دوسری طرف بچوں کے لئے کچھ جھولے لگے ہوئے تھے۔

میری اہلیہ اور ماریہ جھولوں کی طرف چلی گئیں۔میری طبیعت نیند نہ پوری ہونے کے باعث بوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے جھیل کنارے ایک میز کا انتخاب کیا جہاں چشمے کے گرنے سے پیدا ہونے والی موسیقی کی آواز پہنچ رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں بڑے اطمینان سے میز پر لیٹا اور ماحول کو انجوائے کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔ایک گھنٹے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ترک بھائیوں نے لکڑی والے بن میں رکھ کر تازہ تازہ چکن تکہ بھیجا ہے۔اب اس نعمت سے انصاف نہ کرنا ناشکری ہوتی چنانچہ جبڑوں کو جبری مشقت میں ڈالنا پڑا۔ تکے کا ذائقہ ہمارے جیسا ہی تھا۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

قطعات

کتنا سچّا ہے تو، کتنا پیارا ہے تو
سارے ٹوٹے دلوں کا سہارا ہے تو
اس جہاں میں اگر غم کے مارے جیئے
تو اسی آس پر کہ ہمارا ہے تو

ہر ایک شخص میں ہوتی کہاں مروّت ہے
ہر ایک شخص کہاں دل نواز ہوتا ہے
یہ درد مندی و نرمی خدا کی رحمت ہے
جسے عطا ہو وہی سرفراز ہوتا ہے

نفرتوں کے شجر کاٹ دو، کاٹ دو
جتنا سکھ بانٹ سکتے ہو تم بانٹ دو
لوگ سائے میں کھنچ کر چلے آئیں گے
جلتے صحراؤں کی دھوپ کو پاٹ دو

محبت میں انا کا مسئلہ ہوتا نہیں ہے
یونہی بیٹھے رہو تو فیصلہ ہوتا نہیں ہے
جو جُھک جاتا ہے وہ پاتا ہے عزّت
کوئی چھوٹا بڑا یہ سلسلہ ہوتا نہیں ہے

ابو یحییٰ کی نئی تصنیف

''حدیثِ دل''

زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے رہنما تحریریں

جو دل سے لکھی گئیں اور دل والوں کے لیے لکھی گئیں

نظرثانی اور خصوصی اضافوں کے ساتھ ابو یحییٰ کی کتاب

''تیسری روشنی''

شائع ہوگئی ہے

- ☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات۔ تلاش حق کی سچی کہانی
- ☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد
- ☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب
- ☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان
- ☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف
- ☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 0332-3051201)

ایک مردِ صالح کی نصیحت

’’ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار رہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے۔ اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔

یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا’’ بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے‘‘۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات تو ہرگز نہ مان۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔

اور ان کے طریقے کی پیروی کر جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔

(اور لقمان نے کہا تھا کہ) بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔

اے میرے بیٹے!، نماز کا اہتمام رکھ،

نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کر،

اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر، یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین پر اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔‘‘ (لقمان 31:19-12)